قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں کونیاتی عناصر

ڈاکٹر راحیلہ لطیف
لیکچرار اردو
گورنمنٹ سید چراغ شاہ ڈگری کالج قصور

COSMIC ELEMNTS
IN QURATULAIN'S FICTION

Raheela Lateef, PhD
Lecturer in Urdu
Govt. Syed Chiragh Shah Degree College, Kasur

Abstract

The article discuses cosmological elements with reference to the novels of Quratulain Haider. She has constructed an interesting relationship of the universe, time and space with human being. She has used philosophical, scientific and rich traditional eastern and western literary techniques in her approach. She has established a diverse and incredible cosmic character in her work which presents a spectacle of integrity among humanity, God and the universe.

Keywords:

قرۃالعین حیدر، عبدالمغنی، آئی رونیکل، ناول، آگ کا دریا، کائنات، تشکیل، تہذیب، تاریخ، کونیات، علت، معلول

کونیات جو کائنات کی تشکیل کا علم ہے،اس میں سلسلۂ علت ومعلول کے تحت قدمانے ذاتِ باری تعالیٰ کو وجہِ تکوینِ کائنات قرار دیا ہے،علاوہ ازیں اس میں کائنات میں انسان کے مقام کی بات اور مادی وجود کی نوعیت کے ساتھ ساتھ تصورِ ارتقا سے بھی بحث کی جاتی ہے جس کے تحت اُن تمام تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو ایک خاص عمل سے گزر کر اختتام پذیر ہوں۔پھر کونیات کے تحت ہی تصورِ زمان و مکاں کے مختلف نظریات اور امکانات بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔

قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں کائنات اور اس کے مختلف مظاہر باقاعدہ ایک کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں جو نہ صرف انسان، وجودِ باری تعالیٰ اور کائنات کے تعلق کی ہم آہنگی کی طرف بلیغ اشارہ کرتے ہیں بلکہ مظاہرِ کائنات انسان کے دکھ درد اور خوشیوں میں پورے طور پر شریک بھی ہوتے ہیں اور اپنے بدلتے ہوئے رنگوں کے توسط سے انسان کی ہر لحظہ بدلتی کیفیات کا ساتھ بھی دیتے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے'' کا آغاز بھی بل کھاتے طویل پہاڑی راستوں، بکھری ہوئی سرخ چٹانوں کے پیچھے مدھم ہوتے نارنجی آفتاب، شام کی خنک ہواؤں، خودرو کوہستانی پھولوں کی تیز مہک، شفاف چشموں پر جھکی انجیر کی ڈالیوں اور شام کے گرتے ہوئے اندھیرے کی متحرک تصاویر سے ہوتا ہے جو اپنے خوبصورت کرداروں کے تخیل کی کیفیات کی آئینہ داری کے لیے نہایت موزوں پیش منظر ثابت ہوتی ہیں۔ناول نگار کے سامنے فطرت کا ہر مظہر متحرک و متکلم ہے یہاں تک کہ آغاز سے انجام تک سناٹا ایک مکمل جاندار کردار ہے، یہاں انسان کو تو جو بے چینی ہے سو ہے لیکن اُس کے ساتھ رات بھی بے قرار ہے:

> ''۔۔۔رات کی بے چین تاریکی میں یہ سناٹا زیادہ گہرا ہوجاتا تھا۔زیادہ گمبھیر تا سے گونجتا تھا۔۔۔''(۱)

یہاں فطرت کے مظاہر کا تحرک ناول کی تیج پر ویسے ہی بار پاتا ہے جیسے انسانی کردار۔پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہتی ہے،ندی کا سکون اور خاموشی اس کی روانی سے ہویدا ہے اور پھر کونیات کا اہم ترین مبحث اور قرۃالعین حیدر کا مرغوب ترین موضوع زماں کا تصور بھی سامنے آتا ہے جب''وقت کے اس بہت بڑے پاگل کردینے والے صحرا میں''ایک اور دن طلوع ہوتا ہے۔گونجتے ہوئے اندھیارے میں بہت سی شگفتہ جوان ہنستی ہوئی آوازیں بڑا آئی رونیکل (Ironical) تاثر دیتی ہیں کہ انھیں بھی اس پاگل کردینے والے وقت کے صحرا میں بالآخر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا،تیزی سے بہتا وقت زندگی کی خوبصورتیوں کا اطمینان سے نظارہ کرنے کی مہلت بھی نہیں دیتا اور اس ناول کے کرداروں کو قرۃالعین حیدر کے سبھی ناولوں کے کرداروں کی طرح وقت کی گذران کا تکلیف دہ احساس بہت تنگ کرتا ہے، وہ آنے والے وقت کے لیے بھی متجسس ہیں اور ہست میں رہتے ہوئے نیست کے متعلق بھی جاننا چاہتے ہیں کہ شاید وہ سکون پاسکیں۔یہ کردار جب کسی شدید جذباتی دھچکے

سے دہل جاتے ہیں تو کائنات بھی ان کے جذبات کی شدت کا ساتھ دیتی ہے، ہوائیں بند ہو جاتی ہیں، آسمانوں میں ستاروں کی آگ شدت سے سلگ اٹھتی ہے اور کرۂ ارض تیزی سے گھومنے لگتا ہے۔ پی چو جب شدید غصے کے عالم میں اپنے دوستوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر نکلتا ہے اور حادثے کا شکار ہوتا ہے تو مظاہرِ کائنات اس کے قرابت دار بنتے ہیں، ہوائیں اس کے گرد منڈلا کر روتی ہیں اور کھیت گہرے وحشتناک سانس لیتے ہیں۔ پی چو ہسپتال میں ہے اور اس کی بہن رخشندہ جو رقصِ حیات ہے اور غمگین ہے تو فضا کا سکوت اور ہوائیں بھی آہیں بھر رہی ہیں، تندرست ہونے کے بعد پی چو کسی کو بتائے بغیر ہسپتال سے روانہ ہو جاتا ہے تو رخشندہ اپنی زمین، اپنی گیہوں کی بالیوں، ہوا کی نمی، مٹی کی خوشبو (جو ارتقائے حیات کے استعارے ہیں) میں پناہ گیر ہوتی ہے لیکن تقسیم کے فسادات زمیں کی بیٹی سے ماں کا قرب چھین لیتے ہیں تو ہوائیں زور زور سے روتی ہیں، چیختی چلاتی، سرخ رات خاموش ہو جاتی ہے اور جزیرے کے کنارے لہریں مارتا سمندر رات بھر روتا ہے جب وہ کرسٹابل کو رخصت کرنے بمبئی آتی ہے:

> ''کائنات یکلخت بہت تیزی سے چاروں اور ڈولنے لگی۔ فضا کی چیخیں بلند ہو گئیں، شعلے اونچے اٹھتے گئے، چاند تیزی سے گھومنے لگا، عناصر کے طوفان کی گھن گرج کے ساتھ ساتھ تاریک ہوائیں فراٹے بھرنے لگیں۔ زمیں آسمان، ساری دنیا، ساری کائنات، سب سرخ ہو گئے --- مرے ہوئے انسان ان گنت مرے ہوئے انسان چاروں طرف نیچے گر رہے تھے۔ گدھ چکر کاٹ رہے تھے گیدڑ چیخ رہے تھے، چیلیں منڈلا رہی تھیں --- سرخ پپوٹوں میں انتہائی تیز جلن کہیں سے گھس آئی تھی، کرۂ آفتاب اپنی انتہائی تیزی کے ساتھ زمین سے ٹکرا گیا تھا---''(۲)

یوں مظاہرِ کائنات اور زمان و مکاں انفرادی اور اجتماعی وجود کی تمام کیفیات میں پورے طور پر شریک رہتے ہیں کیونکہ ربِ کائنات نے زمین و آسمان کے مابین سب کچھ اشرف المخلوقات کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ اور یہ تصور قرۃ العین حیدر کے ہاں بڑے رومانوی اور جمالیاتی رنگ میں ابھرا ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لیے ڈاکٹر عبدالمغنی کا خیال ہے کہ وہ اپنے محسوسات و مطالعات کو اُن کی اصل شکل میں قاری تک یوں منتقل کرتی ہیں کہ اُس پر وہی اثر ہوتا ہے جو فن کار کے ذہن پر ہوا۔ (۳)

لہٰذا قاری بھی اپنے گرد موجود متحرک کائنات کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔

اسی طرح ''سفینۂ غمِ دل'' بھی بحرِ حیات میں بہتے ہوئے وقت کی تیزی کے احساس کو فراموش نہیں کرتا۔ اس ناول کے آغاز میں ہی مس کیتھلین چیو جو لیڈی اسٹیلا کی ملازمہ ہیں چند سطروں میں ماضی کے سات برسوں کا احاطہ کرتے ہوئے وقت کی آزادہ روی سے نالاں نظر آتی ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں کھیلتے بچوں کا بچپن

کتنی تیزی سے گزر گیا تھا۔وقت یہاں بھی ایک باقاعدہ کردار کے طور پر سامنے آتا ہے جو خود تو پوری آن بان اور شان وشوکت کے ساتھ قائم ودائم رہتا ہے لیکن انسانوں کو فنا کے گھاٹ اتارتا چلا جاتا ہے۔انگلستان کی جانب محوِ سفر ریاض رات کے متعلق سوچتا ہے تو محسوس کرتا ہے:

''۔۔۔کائنات اپنی ابتدا کی طرف واپس جا چکی ہے۔ندیاں، پہاڑ، دور افتادہ جنگلوں کے راستے، یہ سمندر۔۔۔ لمحات کا سنگین تکلیف دہ تسلسل جو نغمے کے ستونوں کو اوپر اٹھاتا اس کربِ مسلسل کی فصیلیں کھڑی کررہا ہے۔۔۔''(۴)

فواد بھی وسعت کے آفاقی احساس کے ساتھ موت کے متعلق سوچتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ راحیل کے مرحوم والد دراصل ابدیت میں داخل ہو گئے ہیں۔اُسے مدھم اور دور کی ندی میں بہتی ہوا اور رات کے جنگلوں میں نکل آنے والے سبز پرندوں کی خاموش صدائیں بھی سنائی دیتی ہیں اور مستقبل کی طرف پل بنا کر گزرنے کا خیال، لمحۂ حال میں کھلتے ہوئے محفوظ پھول اور مستقبل میں ٹوٹ جانے والے بدقسمت پتے سب سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔اسی طرح میرا نلنی راجونش ناول نگار کے نظریۂ وقت کو یوں بیان کرتی ہے:

''وقت۔۔۔اس نے پھر خوف کے احساس کے ساتھ سوچا۔وقت جو رواں تھا، جس طرح آرک کے پیچھے آبشار تیزی سے گر رہا تھا۔اور وقت۔جو منجمد تھا۔جیسے سامنے چوٹیوں پر ہما چاندنی میں جھلملا رہی تھی۔''(۵)

وقت کا یہی متناقض تصور''آگ کا دریا'' میں زیادہ وضاحت اور پختگی کے ساتھ سامنے آتا ہے لہٰذا جو لوگ قرۃ العین حیدر کے پہلے دو ناولوں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے وہ ان کے فن کے ارتقائی سفر کا ادراک ہی نہیں رکھتے۔

وقت، کائنات، تہذیب، تاریخ، خدا اور انسان کا یہ تعلق قرۃ العین حیدر کے فکر وفن کے ساتھ ارتقا پاتا ہوا جب''آگ کا دریا'' کا روپ دھارتا ہے تو اس کی تابناکی ہر دفعہ سامنا ہونے پر شعور کی آنکھیں چندھیا دیتی ہے۔اپنی اشاعت کے وقت سے تا حال زیادہ تر تنقید برائے تنقید کا نشانہ بنا رہنے والا''آگ کا دریا''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی آفاقی وسعت اور گہرائیِ فکر کا لوہا زمانے سے منوا رہا ہے اور کونیاتی عناصر کے مطالعے کے حوالے سے اگر اسے اردو کا سب سے اہم ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس میں زماں کے پیچیدہ مبحث کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، ناول کا عنوان ہی دراصل وقت کی علامت ہے اور آغاز میں ایلیٹ کی نظم Four Quartet کے اقتباسات اس حقیقت پر صاد کرتے ہیں کہ دریا وقت کے تسلسل کی علامت ہے:

''لاشوں اور خس وخاشاک کو اپنی موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے، قائم بھی رکھتا ہے۔
میں اکثر سوچتا ہوں کیا کرشن کا یہی مطلب تھا

کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے

.............الوداع نہیں ۔ بلکہ ۔ آگے بڑھو

مسافرو!''(۶)

ہر دور میں اہلِ فکر و نظر، فلاسفہ اور سائنس دانوں نے وقت کو مختلف انداز میں سمجھا ہے لیکن یہ مسئلہ ابھی تک کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا۔ اپنے مشاہدے کی دنیا میں ہم ایک مسلسل تغیر سے دوچار رہتے ہیں اور یکے بعد دیگرے اشیا و حوادث کا ادراک کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی تواتر نے تصورِ زماں کو جنم دیا ہے جسے ادراکی یا نفسی اور تصوراتی یا منطقی نقطہ ہائے نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اول الذکر کو ہم ماضی، حال اور مستقبل کے طور پر مدرک کرتے ہیں جبکہ مؤخرالذکر نفسی مشاہدوں کی تعمیم کے واسطے سے ہم تک پہنچتا ہے اور اسے مجرد زماں (Abstract Time) بھی کہا جاتا ہے جس کے مطابق حال میں کوئی وقفہ یا فاصلہ نہیں اور ماضی اور مستقبل کی مثال اسی کے لامتناہی پھیلاؤ میں ہے۔ زماں کے ان دونوں زاویہ ہائے نظر کے تجزیے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ زماں ایک کلیت ہے اور مختلف اوقات اس کے حصے ہیں، یہ ابتدا اور انتہا سے عاری لامتناہی ہے، یہ مسلسل ہے اور اس کے مختلف حصوں کے مابین کوئی وقفہ یا خلا موجود نہیں۔ قدیم یونان میں پارمی نائڈیس (Parmenides) اور ہیراقلیطوس (Heraclitus) کے مابین اس حوالے سے اختلاف تھا کہ پارمی نائڈیس تغیر کو غیر عقلی التباس قرار دیتا تھا اور ہیراقلیطوس کے مطابق کوئی غیر متغیر مستقل وجود نہیں ہے۔ پھر دوسرا بڑا اختلاف نیوٹن (Newton) اور لائبنز (Leibnitz) کے درمیان تھا۔ نیوٹن ایک زمانِ مطلق کے وجود پر یقین رکھتا تھا جو حوادثات سے ماورا اپنا آزاد وجود رکھتا ہے یعنی زمانِ مطلق یا ریاضیاتی وقت بغیر کسی خارجی تعلق کے یکساں طور پر رواں دواں ہے لیکن لائبنز کے مطابق زمانہ حوادث سے الگ کوئی شے نہیں۔ کانٹ کا تصورِ زماں ان تمام اختلافات کے مابین مفاہمت کی کوشش ہے جس کے مطابق زمان ایک قبل از تجربی ادراک ہے یعنی تصورِ زماں تجربے سے ماخوذ نہیں۔ برگساں دنیا کے متغیر مظاہر سے بہت متاثر ہے، مسرت اور خوشگواری کے ایک بار گزر جانے والے لمحات لوٹ کر نہیں آتے کیونکہ تغیر کائنات کا بنیادی اصول ہے، اس میں کوئی خلا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا کل ہے جس میں ماضی حال میں مدغم ہوتا ہے اور مستقبل کی پیش بندی کرتا ہے۔ پھر آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے بہت کچھ اتھل پتھل کیا جس میں وقت کی ابتدا بگ بینگ سے ہوتی ہے اور زمان و مکاں ایک ساتھ وجود میں آتے ہیں جس سے یہ سوال سامنے آیا کہ بگ بینگ سے پہلے کیا تھا تو اس حوالے سے اسٹیفن ہاکنگ، راجر پین روز کے ساتھ مل کر Singularity theorem پیش کر چکے ہیں اور فروری ۲۰۱۰ء میں سامنے آنے والی ان دونوں ماہرین کے لیکچروں پر مبنی کتاب The Nature of space and time بھی خطِ مستقیم میں آگے بڑھنے والے اور پیچھے کی طرف حرکت نہ کر سکنے والے وقت کی نوعیت کو سمجھنے کی اہم کوشش ہے جس میں

ہاکنگ نے نظریۂ اضافیت کو ناکافی بتایا ہے اور لامحدود کے مفروضے کو کشش ثقل کی کوانٹم تھیوری کے ساتھ ملا کر کائنات کے متعلق وضاحت کی کوشش کی ہے اور روجر پین روز نے کہا ہے کہ کائنات لامحدود ہے اور یہ ہمیشہ پھیلتی رہے گی ۔(۷) یہ کتاب پرنسٹن یونیورسٹی سے شائع ہوئی ہے جہاں سے Hugh Everett-111 نے ۱۹۵۷ء میں(Many worlds Interpretation) کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی اور اس نظریے کی حمایت ہاکنگ بھی کرتا ہے اور قرۃالعین حیدر ۱۹۵۹ء میں شائع ہونے والے اپنے ناول ''آگ کا دریا'' میں بھی اس تصور کا احاطہ کرتی ہیں ۔

وقت کے حوالے سے معروف مباحث کا یہ اجمالی جائزہ ''آگ کا دریا'' کے کونیاتی عناصر کے مطالعے سے پہلے اس لیے ضروری تھا کہ اس کے بغیر ان مباحث کی تفہیم میں تشنگی کا اندیشہ تھا۔ جس طرح ''آگ کا دریا'' میں اجتماعی روحِ انسانی کا تصور پیش کیا گیا ہے کہ ازل تا ابد انسان اپنے مقصدِ وجود کی تلاش میں سرگرداں ہے تو اسی طرح انسان اس کائنات کی وسعت اور وقت کی حیر تناکی کا مشاہدہ بھی کرتا چلا آیا ہے اور قرۃالعین حیدر ان تصورات کا جامع طور پر احاطہ کرتی ہیں ۔ پروفیسر عتیق احمد لکھتے ہیں کہ جب گوتم نیلمبر ''تم کون ہو بھائی؟'' کے جواب میں ''میں ہوں'' کہتا ہے تو کردار کی شناخت نہیں ہوتی بلکہ ''وقت'' کی شناخت ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ یہاں کردار کی آواز میں اُس کا وقت گونجتا ہے ۔(۸)

بدھ سے ایک صدی بعد موجود گوتم نیلمبر بھی وقت کے کل میں ماضی سے خوفزدہ ہے لیکن اسی کی تصویر کا دوسرا رُخ ہری شنکر اس سے بے نیاز ہے، گویا گوتم وقت کے ادراکی تصور اور ہری مجرد زماں کے تصور سے منسلک ہے ۔ گوتم اپنے پرکھوں کے عظیم ناموں کے جاری و ساری تسلسل کی وجہ نہ جان پایا تھا:

> ''آزادی نہیں ہے --- میں بندھا ہوا ہوں --- یہاں تک کہ ایک روز تاریخ --- ناموں کا تسلسل --- زمان و مکان مجھے نگل جائیں گے ۔''(۹)

وقت کے بہاؤ سے خوفزدہ گوتم جب زندگی اور موت کی تمنا سے آزادی حاصل کر کے سرجوندی کے اُس پار پہلے سے آزادی حاصل کر چکنے والے ہری تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو پانی کا ایک زوردار ریلا اسے کنارے کے بہت قریب لے جاتا ہے لیکن تب پانی کی لہریں بہت بلند ہو جاتی ہیں اور وہ وقت کے سیلِ رواں میں نظر آنے والی ایک چٹان کو تھامتا ہے لیکن اُس کی انگلیاں کٹ چکی ہیں لہٰذا چٹان کا لمحاتی احساسِ تحفظ بھی جلد ہی اس سے چھن جاتا ہے ۔ یہاں ندی وقت کے بہاؤ اور چٹان وقت کے انجماد اور ماضی کی علامت ہے اور ماضی ہی فانی انسانوں کو وقت کی کلیت میں محفوظ معلوم ہوتا ہے لیکن وہ کٹی ہوئی انگلیوں کے ساتھ اس پتھر کو زیادہ دیر گرفت میں نہیں رکھ پاتے کہ فنا ان کی منتظر رہتی ہے ۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ یونانیوں اور مغربیوں سے بہت پہلے ہندیوں نے وقت سے متعلق اپنے تصورات تاریخ کے اوراق میں محفوظ کیے تھے اور بعد میں آنے

والے نظریات کسی نہ کسی طور پر ان سے متعلق تھے، اور یہ نظریات ان کی مذہبی کتابوں میں بیان ہوئے تھے۔ یہ ابدیت کے فلسفے کی حامل سرزمین تھی اور یہ فلسفہ پورے تسلسل سے نسل در نسل منتقل ہو رہا تھا۔ گوتم اور ہری شنکر بھی ناموں کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے، اسی طرح سرزمینِ ہند پر قدم رکھنے والا ابوالمنصور کمال الدین جب یہاں کے فلسفوں کو پڑھتا ہے تو اگرچہ وہ آئن سٹائن سے بہت پہلے کے دور میں زندہ ہے اور اپنے سے بھی صدیوں پہلے کے ہندی فلسفے کا مطالعہ کر رہا ہے جس سے وہ یہ اخذ کرتا ہے کہ تکوینِ کائنات میں علتِ اولیٰ خدا ہے:

''وقت کے متعلق اس نے پڑھا کہ زمان و مکاں اضافی ہیں اور محض ایسا خلا ہیں جس میں حقیقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وقت کے مسئلے پر کمال بہت گڑبڑایا۔ یہ مسئلہ بھی سامی نظریۂ کائنات سے جداگانہ تھا جس میں ابتدائے آفرینش سے روزِ قیامت تک ایک مخصوص باضابطہ وقفہ تھا۔ جس کے بعد ابدیت ہی ابدیت ہوگی لیکن یہاں تو ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی اور کوئی ایسا مخصوص نقطہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا ہو۔ یہ حکماء کہتے تھے کہ وقت کا لمحہ مختلف انسانوں کے لیے مختلف ہے۔۔۔'' (۱۰)

وقت کا یہ اختلافی مسئلہ ہر زمانے میں موضوعِ بحث رہا لہٰذا یہ ناول جس کے کینوس پر ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ پھیلی ہوئی ہے یہاں بھی ہر دور اور ہر کردار وقت کے تابع نظر آتا ہے۔۔۔ وقت کا تسلسل اور اس کا منجمد ہونا تو اس کی متناقض کلیت کو ظاہر کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ لحہ لحہ انسانوں کو فنا کے قریب لے جاتے وقت کو موت بھی کہا گیا ہے۔ جب سرل کا نوجوان کلرک گوتم نیلمبر دت لکھنؤ پہنچتا ہے تو وہاں کی زندگی کا تنوع اور رنگا رنگی بھی اسے وقت کی کلیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اگرچہ وقت کو مختلف حصوں میں قید کر لیا گیا ہے لیکن وہ مٹھی میں بھری ریت کی مانند پل پل چھن چھن اس قید کو توڑتا چلا جاتا ہے اور انسانوں کے جلوس کو قبروں میں اتارتا ہے اور پھر جب وقت کا تسلسل بیسویں صدی کے نصف اول کے اواخر میں موجود ناول نگار کی اپنی نسل تک پہنچتا ہے تو یہاں ایک آدرش پرست گروہ اس کا منتظر ہے جو ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''سفینۂ غمِ دل'' کے گروہ کی نسبت زیادہ حقیقت پسند ہے:

''میرا ماضی محض میرا ہے'' کمال نے طلعت کی بات دہرائی۔

''اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے''۔ ہری شنکر کی آواز گونجی۔

''لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔ طلعت نے اداسی سے کہا.........''

''تمھاری مدد طلعت بیگم شاید آئن سٹائن بھی نہیں کر سکتا''۔ ہری شنکر نے کہا۔'' (۱۱)

اپنے دور کے فلسفے، سائنس اور سیاسی و فکری منظرنامے پر نظر رکھنے والے اس گروہ کے لیے وقت کا

مسئلہ لاینحل ہے، یہ لوگ ماضی کے ستونوں کے لمس کے ذریعے خود کو ماضی میں موجود پاتے ہیں اور ماضی ان پتھروں کی صورتِ حال میں بھی موجود ہے۔وقت کی ہلاکت خیزی اور علامتوں کی رمزیت کا قائل یہ گروہ لحظہ لحظہ اپنے خاتمے کی طرف بڑھتے ہوئے وقت کو بہتا ہوا دریا اور پتھر کو وقت کی علامت قرار دیتا ہے یعنی پتھر وقت کی منجمد شکل ہے اور کائنات کا خاتمہ ان کے نزدیک چوہے کی موت کی طرح یقینی اور غیر اہم ہے۔طلعت جو اپنی عزیز دوست نرملا کی موت کے بعد سینٹ جانز ووڈ کے فلیٹ میں موجود ماضی پر غور کر رہی ہے، وقت کے جس پیٹرن میں وہ بیٹھی تھی، اسی پیٹرن میں ایک اور جگہ موجود تھی لیکن درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر پیچھے نہ جاسکنے کا احساس پوری طرح غالب تھا۔ وہ صرف آگے کی سمت جاسکتی تھی، پیچھے نہیں۔آئن سٹائن کے تصورِ زمان میں بھی ایک خطِ مستقیم کا سفر نظر آتا ہے اور سٹیفن ہاکنگ نے بھی اس سوال سے بحث کی ہے کہ وقت کی حرکت پیچھے کی طرف (Backward) کیوں نہیں لیکن قرۃ العین حیدر فکشن نگار ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے حال کے کرداروں کو ماضی کے بھوتوں سے ملاتی ہیں جو وقت کے پیٹرن میں اپنی جگہ موجود ہیں اور یہ مستقبل کے بھوتوں سے خوفزدہ ہیں۔قرۃ العین حیدر وقت کی ابدیت کی قائل ہیں اور اس کی بے پناہ طاقت کا اظہار متعدد بار کرتی ہیں، یہاں ماضی، حال، اور مستقبل ساتھ ساتھ چلتے ہیں:

> ''وقت نے کہا: مجھے پہچانو۔ میں تمھارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا۔تمھارا خیال تھا لمحے اپنی جگہ قائم رہیں گے، لیکن تمھارا یہ خیال بھی غلط تھا۔مجھے دیکھو اور جانو۔ میں جا رہا ہوں پل پل، چھن چھن ---میں حدِ فاصل ہوں ---''(۱۲)

قرۃ العین حیدر کے تصورِ وقت کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری کہتے ہیں کہ یہ باتیں اردو ناول میں پہلی بار سننے میں آئی ہیں۔(۱۳)

یہاں جب ہم دیکھتے ہیں کہ وقت ہی مارتا اور بچاتا ہے تو اس حدیثِ قدسی کی طرف دھیان جاتا ہے جس کے مطابق زمانے کو برا نہ کہنا چاہیے کہ ربِ موجودات خود زمانہ ہے۔ایڈورڈ ہیری سن نے کونیات کی کئی سائنسی اور غیر سائنسی سطحیں بتائی ہیں اور وقت کی نوعیت پر بات کرتے ہوئے تضاد کے در آنے کو فطری قرار دیا ہے۔(۱۴) خواہ وہ مذہبی نظریۂ وقت ہو یا فلسفیانہ---ادراکی یا تصوراتی، آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت یا کثیر دنیائی توضیحی نظریہ (MWI)، قرۃ العین حیدر وقت کی کلیت، طاقت اور تسلسل کا احاطہ پوری جامعیت سے کرتی ہیں اور وقت کے تسلسل پر حدیں قائم کرنے والوں پر طنز بھی کرتی ہیں، جب کمال پاکستان سے ہندوستان جاتا ہے اور سدرشن یکشنی سے کہتا ہے کہ تر اخالق اب مجھ تک اپنا پیغام نہیں پہنچا سکتا کیونکہ جغرافیائی حد بندیاں کرنے والوں نے اپنے حسابوں وقت کے تسلسل میں بھی رخنہ ڈالا ہے۔رؤف نیازی ''آگ کا دریا'' کے تناظر میں قرۃ العین حیدر کے ریاضیاتی اور نفسی تصورِ وقت کو اپنے عہد کی سائنسی معلومات سے ہم آہنگ قرار دیتے ہیں۔(۱۵) اور ہمارے مطابق نہ صرف سائنسی معلومات بلکہ یہاں تصورِ وقت اپنے عہد کی روحِ وقت سے بھی

ہم آہنگ ہے اوراس روح کا تسلسل بھی ہے۔ایک نباضِ زمانہ کے قلم سے نکلا ہوا یہ دورِ تسلسل جب مشرقی پاکستان کے استحصال کا ذکر کرتا ہے تو مستقبل کی پیش بینی بھی کر رہا ہوتا ہے، یوں یہ محض سائنسی معلومات کی ہم آہنگی کی حد سے نکل کر مجرد زماں اور وجدان کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

''آخرِ شب کے ہم سفر'' میں بھی وقت کا تسلسل ہی توجہ کھینچتا ہے اور ہم دیکھ پاتے ہیں کہ مظاہرِ کائنات اور زمان و مکاں کس طرح انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں دخیل ہیں یہاں چونکہ مرکزی توجہ انقلابی اور سیاسی سرگرمیوں پر صرف کی گئی ہے لیکن وقت کا احساس اُن کے فکر و شعور کا ایسا ناگزیر جزو ہے کہ وہ اسی طرح تمام تر انقلابی، سیاسی و سماجی زندگی کی پیش کش میں سامنے آتا ہے جیسا کہ وہ حقیقی زندگی میں ہوتا ہے اور ہم وقت کی اس آگہی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتے:

''۔۔۔ بیکراں زندگی میں ہر آواز، ہر کرب اور وقت کا ہر عکس موجود ہے اور زندہ ہے اور باقی ہے۔۔۔''(۱۶)

یہاں سورج دیپالی کے کم سن بے فکر اور مسرور چہرے کا مشاہدہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ڈوبتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ ایسا بے فکر چہرہ دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے گا کہ ہیراقلیطوس کے بقول ایک دریا میں دو مرتبہ نہیں اترا جا سکتا، دیپالی جو زندگی کو مسلسل تحرک کے فلسفے کے تحت بتا رہی تھی --- ماں کی وفات کے بعد باپ اور بھائیوں کا خیال رکھنا اور معاشی معاملات میں بھی باپ کا ہاتھ بٹانا اور پھر ساتھ ہی قوم کے لیے اپنے چچا کی آدرش پرستی کی حفاظت کرتے ہوئے انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینا اس کا مقصدِ حیات تھا --- تو اس سارے تحرک میں وہ وقت کے اندرونی سفر میں خود سے نہ تھکنے کا بھی کہتی رہتی یعنی بیرونی وقت کے علاوہ ایک اندرونی وقت کا تصور بھی ہمیں یہاں ملتا ہے اور زندگی کی ہر نئی صبح کو آفاقی رات کے اتھاہ سمندر کے کنارے ایک اجنبی ساحل قرار دیا گیا ہے جس پر اپنے خوابوں کی کشتی سے اترنے والے یا خوش ہوتے ہیں یا غم زدہ لیکن یہاں فطرت کے ساتھ تعلق اور بے تعلقی کا ایک امتزاج سا ملتا ہے کہ وقت کے سفر سے گزر جانے والوں سے بے پروا فطرت اپنی بے نیازی میں زندہ رہتی ہے۔اور زندگی کا میلہ ابدیت کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔کسی انسان کے ہونے یا نہ ہونے سے وقت کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ ۴۷ء کی خون آشام یادوں سے، نہ ۷۱ء کے قتلِ عام سے --- کسی بھی چیز سے ارتقا نہیں رکتا، اسی لیے تو وہ ''آخرِ شب کے ہم سفر'' کے اختتام میں کہتی ہیں:

''لاکھوں برس سے سورج اسی طرح طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔اور طلوع ہوتا ہے۔اور غروب ہوتا ہے اور طلوع۔(۱۷)

اگر بہت سے پچھلوں کی طرح ریحان، دیپالی، روزی، جہاں آرا اور یاسمین کی زندگیاں اور آدرش اس تسلسل کی نذر ہو گئے تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔یہ رویہ بھی قرۃ العین حیدر کی فکر میں بار ہا ابھرتا ہے اور معرکۂ بیم ورجا

کی کیفیت لاتا ہے۔ ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں بھی زماں کا مبحث آغاز تا انجام قرۃ العین حیدر کے وقت کے متعلق نظریے کو بڑے ربط سے بیان کرتا ہے، اپنے آبا کی ہجرتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں بارھویں اور بیسویں صدی کے درمیان صرف ایک پل کا وقفہ محسوس ہوتا ہے، ساتھ ہی وہ سلسلۂ روز و شب کی میکانکی وحدت میں دوہرائے جانے والے مسلسل عمل میں انسان کی حیثیت کا سوال بھی اٹھاتی ہیں اور وقت انھیں تیغ قاطع اور رہ بانِ درخشاں معلوم ہوتا ہے اور وقت کو وہ حادثات وواقعات کے الاؤ کے سامنے بیٹھا پیر جہاندیدہ بھی کہتی ہیں جو کرم خوردہ شجروں کا بستہ لپیٹ کر عدم کی تاریکی میں لامکاں میں داخل ہو جاتا ہے جہاں کوئی گفتگو وجستجو نہیں اور وقت ایسی لوحِ محفوظ بھی ہے جس پر واقعات وحادثات کا کوئی اثر نہیں ہوتا:

''۔۔۔ پچھلا وقت آج سے منسلک ہے۔کوئی سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ ازل سے ابد تک وجود پیہم اور مسلسل اور مستقل ہے۔۔۔ تاریخ کی مجموعیت اور تسلسل اور معنویت کا جس قدر شدید احساس ہم مجذن لوگوں کو ہے۔ دنیا کی کسی قوم کو نہیں۔۔۔'' (۱۸)

فطرت کی توضیح کا اُن کا انداز نہایت خوبصورت اور منفرد ہے، رات انھیں ہمالیہ کی چوٹی پر بیٹھی بوڑھی جوگن معلوم ہوتی ہے جو برف کے ٹکڑوں جیسے تاروں کی مالا جپتی ہے، فطرت انھیں تر و تازہ بشاش اور آزاد معلوم ہوتی ہے جبکہ انسان مغموم ومجبور ومعذور۔ وقت کے تسلسل میں ہر شے اپنی جگہ موجود رہتی ہے ۔گزرا ہوا بچپن بھی وقت کے پیٹرن میں محفوظ ہے خواہ ان نقطوں کے درمیان کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو۔ کونیات ارتقا کے حوالے سے بھی بات کرتی ہے۔ قرۃ العین انسانی ارتقا کے حیاتیاتی اثرات کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''Genes کا سفر بہت پر اسرار ہے۔ کسی سادہ دل پُرکھے کی وجہ سے بسلسلہ مالی معاملات مستقل زبردست حماقتیں مجھ سے سرزد ہوتی رہتی ہیں۔۔ (۱۹)

ارتقائے کائنات کے حوالے سے جس نقطے کو وہ خاص طور پر موضوع بناتی ہیں وہ تسلسل ہی ہے۔ آغازِ کائنات کے وقت سے ہوا کا برابر چلنا، پانی کا مسلسل بہنا، اور پھر چاند کے ملاح کا اپنے مسافروں کو فنا کے سمندر میں پھینک کر بھی اپنا سفر جاری رکھنا انھیں بہت مسحور کرتا ہے:

''میرے ہاں ۔۔۔ سارے پیریڈ ساتھ ساتھ چلتے ہیں کوئی دور کسی دوسرے دور سے علیحدہ نہیں گُلِ صد ہزار رنگ۔'' (۲۰)

کارِ جہاں دراز ہے (جلد دوم) کے اختتام میں وہ وقت کو ''مُرا در مُوش'' کے طور پر پیش کرتی ہیں جو فانی اور مضحکہ خیز انسانوں کو بتاتا ہے کہ زمین کی گھاس اور آسمان کے درخشاں ستاروں کی طرح وہ بھی کائنات کے بچے ہیں اور کائنات پیہم اپنے اسرار منکشف کر رہی ہے قطع نظر اس سے کہ کوئی سمجھ رہا ہے یا نہیں لہٰذا خدا کے متعلق جس کا جو بھی تصور ہے اُسے اپنے خالق کی رضا میں راضی ہو جانا چاہیے کیونکہ اپنی تمام تر بیہودگیوں اور کلفتوں کے

باوجود دنیا نہایت خوبصورت اورقابلِ زیست ہے، پھر وہ دریا اور انسان کی زندگی کے سفر کو یکساں قرار دیتی ہیں اور یہ اورموش انھیں بتاتا ہے:

''۔۔۔ میں خود مستقبل سے نکل کر آیا ہوں ۔میں وقت ہوں جو زندگی کا کاغذ کترتا رہتا ہے۔'' (۲۱)

''کارِ جہاں دراز ہے'' کا سارا سفر وقت کے اندرونی ہفت خواں طے کرنے کا قصہ ہے، جلد سوم میں بھی کاروانِ لامکاں کے مسافروں کی گم شدگی پہ حیرت اور تجسس کے ساتھ حقیقت کی مختلف جہات اور تہوں کی تلاش کے عمل کو ہی آگے بڑھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ سوانحی ناول صرف ایک فیملی ساگا کی بجائے زمانوں اور زمینوں میں ایک قوم کا ثقافتی رزمیہ بن کر سامنے آتا ہے کیونکہ قرۃ العین حیدر کا نظریہ ہے کہ ماضی کی بازیافت کا عمل ایک مٹتے ہوئے متزلزل سماج کو ایک مستحکم بنیاد مہیا کرسکتا ہے، ماضی کے شعور سے حال کی زندگی کے انتشار واضمحلال کو ختم کیا جاسکتا ہے۔(۲۲)

بلاشبہ انھوں نے وقت کے تسلسل میں جس طرح سبھی زمانوں کو ایک ساں موجود پاکر ہم تک پہنچایا ہے یہ کسی نابغہ کا کام ہی ہوسکتا ہے،اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ شعور کی کس گہرائی سے وقت کی حشر سامانی کا ادراک کرتا ہے۔

وقت کی ابدیت اور تسلسل کا یہ تصور ''گردشِ رنگِ چمن'' میں میاں کے حوالے سے صوفیانہ آہنگ میں سامنے آتا ہے، راجہ دلشاد علی خان جب میاں کے زیرِ اثر تقلیبِ قلب کے عمل سے گزرتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ سرزمین ہند سے ان کا تعلق صرف ان کی اپنی زندگی کے حوالے سے نہیں بلکہ وہ تو صدیوں سے وہاں آباد ہیں اور جرمن باجی جب گورستان کی دیوار پر بیٹھ کر آسمان کا مطالعہ کرتی ہیں تو انھیں نور اور تاریکی کا لامتناہی سلسلہ حیرت میں ڈالتا ہے اور عربی باجی بتاتی ہیں کہ اولیاء اللہ زمان ومکاں کی قید سے آزاد ہیں اور راجہ صاحب ان تمام بے حد تعلیم یافتہ لوگوں کے مابعد الطبیعیاتی عقائد کی پختگی کا جب خود مشاہدہ کرتے ہیں اور میاں کے تصرفات کے چشم دید گواہ بنتے ہیں تو اس سب کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

''سارا وقت ایک ہے۔قرآنی وقت ۔آن واحد۔خدا کے نزدیک سب آج ہے۔جزا وسزا جاری ہے۔روزِ قیامت بھی ۔آنے والا نہیں ۔موجود ہے۔پھریری سی آئی ۔۔۔'' (۲۳)

راجہ صاحب کو سرِ راہے ملنے والے میاں کے ایک معتقد کائنات کی مسلسل فنا پذیری کے تناظر میں انسان کی بقا کی خواہش کو حیرت سے دیکھتے ہیں:

''۔۔۔ اس کروڑوں اربوں برس کے گیس اور بادلوں اور بارشوں کے درمیانی وقفے میں فقط دس بارہ ہزار سال کی انسانی تہذیب اور اس کے تخلیق کردہ معبود اور ادیان اور فلسفے اور روحانیت

وغیرہ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ جبکہ طرہ یہ کہ ساری کائنات مسلسل پیچھے کھسک رہی ہے۔۔۔"(۴۴)

اس سرپھرے کردار کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے باوجود قرۃ العین حیدر، اقبال کی طرح اُس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام دیکھتی ہیں جس کے پیچھے عشق کی تخلیقی قوت اور خونِ جگر کار فرما ہو۔ برگساں وقت کی نوعیت پر مکاں کی اثر اندازی کو قبول کرتا ہے لیکن اقبال کے نزدیک دوش و فردا کا چکر مسلسل اور مستقل ہے اور خودی کی توانائی فرد کے وجود کو زماں کے سیلِ رواں پر نقش ثبت کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اسی حوصلہ مندی کے ساتھ قرۃ العین حیدر عہدِ نو کا ادراک کرتی ہیں محمود ہاشمی ان کے ہاں تاریخ اور تاریخیت کے تصادم میں عہدِ نو کی پیچیدہ دنیا ملاحظہ کرتے ہیں اور ان کے فن کو اس وژن کی تلاش قرار دیتے ہیں جو عرفانِ ذات کے لیے ضروری ہے۔(۴۵) اور اس وژن میں عصرِ رواں کے سوا اور بے نام زمانے بھی شامل ہیں جو قاری میں بھی ایک گیان پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شمیم حنفی اس سے بھی آگے بڑھ کر قرۃ العین حیدر کے تصورِ زماں کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

> "۔۔۔قرۃ العین حیدر کا شعور ہمیں اقبال کی بہ نسبت اپنے تجربے سے زیادہ قریب اور اپنی رومانی جہت کے باوجود زیادہ حقیقت پسندانہ محسوس ہوتا ہے۔۔۔اقبال کا تصورِ زماں اپنی رفعت کے باوجود وقت کے اس کٹہرے (Time Barrier) کو توڑ نہیں سکا جس کا قیدی ہمارا اپنا عہد اور ہماری اپنی اجتماعی صورتِ حال ہے۔قرۃ العین حیدر کے یہاں ۔۔۔ اس عہد اور اس سے منسلکہ صورتِ حال کی آگہی ۔۔۔ موجود ہے"(۴۶)

"چاندنی بیگم" میں وکی میاں کو مستقبل کی آوازیں پتوں سے چھن کر سنائی دیتی ہیں تو اقبال کو بھی رازِ خدائی معلوم ہے، یہ الگ بات کہ اُن پہ پابندی ہے۔ وہ کہہ نہیں سکتے، اس کے باوجود بہت کچھ کہہ دیا جو حقیقت پسندانہ بھی تھا اور ہماری اجتماعی صورتِ حال اور ہمارے عہد کی آگہی بھی اُن کے تصورِ زماں میں ملتی ہے کیونکہ اقبال ہمیں وقت کے پیرِ جہاں دیدہ سے خبردار کرتے ہیں کہ یہ ہر وقت ہر کسی کو پرکھ رہا ہوتا ہے اور عینی بی بی بھی وقت کی زد سے کسی کو بچتا نہیں دیکھتیں۔لہٰذا یہ بات کچھ اس طرح سمجھی جائے تو مناسب ہوگا کہ قرۃ العین حیدر کا شعور اقبال کے مقابلے میں ہمیں اپنے تجربے سے اس لیے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے پاس ابلاغ کے لیے کہانی کا وسیلہ ہے اور وہ چوپال میں بیٹھے ہوؤں کو اپنے گرفت میں لینا جانتی ہیں، اقبال کا منصب اور وسیلہ ان سے مختلف ہے لہٰذا دونوں کا موازنہ اُن کے دائرہ ہائے کار میں رہ کر کیا جائے تو مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس طرح ہم کرکٹ اور ہاکی کے کھلاڑیوں کے کھیل کے تصور کو مختلف طور پر سمجھتے ہیں اگرچہ دونوں ایک ہی ملک کے لیے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں قرۃ العین حیدر کے تصورِ زماں اور اقبال کے تصورِ زماں کو اُن کے ابلاغی دائروں کے اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی سمجھنا چاہیے۔

اقبالؔ اپنے ابلاغی دائرے کے پیشِ نظر ماسٹر موگرا جیسے غریب آدمی یا پھر میلے میں آئے ہوئے
قوال سے یہ نہیں کہلوا سکتے:

"اللہ تعالٰی کلام مجید میں فرماتا ہے ہم جب چاہیں ان کی شکلیں بدل سکتے ہیں ---
خانصاحب۔ وخت انسان کو ادھر سے ادھر کر دیتا ہے ---" (۴۷)

"خانصاحب پہلے آدمی کا ٹائم قبوتر کی طریوں اڑ جاتا ہے۔ پھر آدمی خود" (۴۸)

یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کا شعورِ وقت ہمیں اپنے تجربے سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے، راجہ وقار حسین عرف وکی میاں جو فطرت کے دیوانے ہیں اُن کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا ظہور مختلف مظاہرِ فطرت میں ہوتا ہے۔ اپنے بھانجے بھانجیوں کی ہڑ دنگی نسل کے متعلق وکی میاں کو یقین ہے کہ خواہ لمحاتی طور پر ہی سہی وہ اس کائنات سے ایک رابطہ محسوس کر سکتی ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان رہ ہی نہیں سکتا۔ جب پنکی اور فیروزہ مسلسل رانا صاحب اور وکی میاں کی حیرت ناک باتوں کو سمجھ نہیں پاتے تو وکی میاں اس جہت کی طرف نکل چلنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ جہاں کوئی تعلقات نہیں بلکہ صرف سناٹا ہے۔

یہ وقت سے آگے نکل جانے کی خواہش ہمیں "آگ کا دریا" میں بھی ملتی ہے اور "کارِ جہاں دراز ہے" میں بھی --- وکی میاں بھی قدما کی مانند ایک آفاقی روح کو علتِ اُولیٰ تسلیم کرتے ہیں۔ ریڈ روز ہاؤس کے نئے مالک شیخ طاہر علی کی بیٹی لیلیٰ سروش، پنکی کو ایک لاما کے متعلق بتاتی ہے:

"---تو وہ کہہ رہا تھا کہ ہر شے اور ہر واقعہ انڈیپنڈنٹ نہیں ہے، ساری کائنات سے ایک فرد کے ان گنت رشتے ہیں۔ نہ کوئی بیگانہ ہے، نہ جدا گانہ ---اور ہر چیز دوسری پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے ---" (۴۹)

پھر وہ معروف مصور طامس ایزلی کے حوالے سے بتاتی ہے کہ ان کے مطابق ہر انسان کی ایک چوتھی سمت بھی ہے جس کا انسان سے سمندر اور ساحل جیسا تعلق ہے اور اس کی لہریں انسان پر آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان لہروں میں ماضی اور مستقبل دونوں موجود ہیں۔ کبھی کبھی ان کا کوئی پیغام انسان کو اندر ہی اندر سنائی دے جاتا ہے، گویا یہ چوتھی سمت انسان کی ساری عمر کے وقت کی تجسیم ہے۔ خسارے کا سودا کرنے والا انسان لحہ لحہ آگے بڑھتی فنا کی ساعتوں سے بے خبر من و تو کے جھگڑوں میں گرفتار رہتا ہے لیکن جب فنا اسے اپنے دامن میں سمیٹتی ہے تو سلسلۂ ارتقا ایک لمحے کو بھی نہیں رکتا۔ یوں قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے کونیاتی عناصر فلسفے، سائنس اور مشرقی و مغربی ادبی روایت کی زرخیزی سے مالا مال اپنا انفرادی کینڈا وضع کرنے میں کامیاب رہتے ہیں اور اردو ناول کے دامن میں ان کی موجودگی اس کے لیے وقار کا باعث ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱)قرۃالعین حیدر،میرے بھی صنم خانے ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۲۰۰۴ء،ص ۵

(۲) ایضاً، ص۲۹۳

(۳) عبدالمغنی ،ڈاکٹر،قرۃالعین حیدرکااسلوب مشمولہ قرۃالعین حیدرکافن،موڈرن پبلشنگ ہاؤس ، دہلی، ۱۹۸۵،ص ۴۸

(۴) قرۃالعین حیدر،سفینۂ غم دل،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۹ء،ص ٦

(۵) ایضاً، ص ۳٦

(۵) قرۃالعین حیدر، آگ کادریا،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۰ء،ص ۵-٦

(۷) Penrose, Roger, Hawking, Stephen W., The Nature of Space and Time, Princeton University Press, Feb.2010, P1-3.

(۸) عتیق احمد، پروفیسر، ''آگ کا دریا -ایک تجزیاتی مطالعہ''،مشمولہ ''الفاظ''علی گڑھ،انڈیا،دسمبر۱۹۸۴ء،ص ۵۵

(۹) آگ کا دریا،ص ۴۲ (۱۰) ایضاً، ص ۱۳۳ (۱۱) ایضاً، ص ۲۲۷ (۱۲) ایضاً، ص ۴۷۷

(۱۳) سہیل بخاری،ڈاکٹر،ناول نگاری،اردوناول کی تاریخ وتنقید،مکتبہ میری لائبریری،لاہور،۱۹٦٦ء،ص ۳۴۱

(۱۴) Harrison, Edward, Cosmology The Science of the Universe, Cambridge University Press, 2000, P.172

(۱۵)رؤف نیازی، ''آگ کا دریا کے تناظر میں ریاضیاتی اور نفسی تصورِ وقت'' مشمولہ قرۃالعین حیدراردوفکشن کے تناظر میں، عالی،ڈاکٹر جمیل الدین (نگران)،حسن ظہیر،ڈاکٹر ممتازاحمدخان،شہاب قدوائی (مرتبین)،انجمن ترقی اردو پاکستان ،کراچی،۲۰۰۹ء،ص ۱۴۰

(۱٦) قرۃالعین حیدر،آخرِشب کے ہم سفر،مکتبہ اردوادب،لاہور،س۔ن،ص ۲۰

(۱۷)ایضاً، ص ۳۹۴

(۱۸) قرۃالعین حیدر،کارِجہاں دراز ہے(جلداول)،مکتبہ اُردوادب،لاہور،س۔ن،ص ۱۲۲

(۱۹)ایضاً، (حصہ دوم) ص ٦۰ (۲۰)ایضاً،ص ۴۳۱ (۲۱)ایضاً،ص ۳۹۰

(۲۲)فاروق عثمان،ڈاکٹر،اردوناول میں مسلم ثقافت،بیکن بکس،ملتان،۲۰۰۲ء،ص ۴۹۲-۴۹۳

(۲۳) قرۃالعین حیدر،گردشِ رنگِ چمن،مکتبہ دانیال،کراچی،۱۹۸۷ء،ص ۵۹۵

(۲۴)ایضاً، ص ٦۵۸

(۲۵)محمود ہاشمی، ''قرۃالعین حیدراوراس کافن''،مشمولہ ''اردوافسانہ روایت اورمسائل''،مرتبہ گوپی چند نارنگ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸٦ء،ص ۴۲٦

(۲٦)شمیم حنفی،مضمون''گردشِ رنگِ چمن''،مشمولہ ''قرۃالعین حیدراردوفکشن کے تناظر میں''،ص ۲۰۵-۲۰٦

(۲۷)قرۃالعین حیدر،چاندنی بیگم،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ، دہلی،۱۹۹۹ء،ص ۲٦۴

(۲۸)ایضاً،ص ۲۷٦ (۲۹)ایضاً،ص ۳۲٦